نئی اردو نظم

پروفیسر شہناز نبی

88-H-2، الیوٹ روڈ، کولکاتہ۔700016، موبائل:9831115579

ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز ایک دم سے نئی یا پُرانی ہو جاتی ہے، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آخر کسی چیز کو ہم نئی کہتے ہیں تو کیوں؟ آج سے کئی دہائی پہلے جب خلیل الرحمٰن اعظمی نے ۱۹۷۲ء میں 'نئی نظم کا سفر' کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی تھی تو نئی نظم کی تعریف مقرر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

> ''جب ہم نئی نظم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی پرانی نظم کا اعادہ یا تکرار نہیں ہے۔ اعادہ یا تکرار میکانکی یا مشینی عمل ہے، جیسے ایک صناع ایک بنے بنائے سانچے سے ایک طرح کی چیزیں ڈھالتا جائے، مگر تخلیقی عمل اعادہ نہیں ہوتا۔ یعنی جب کوئی نیا تجربہ یا کیفیت شاعر کو نظم لکھنے پر آمادہ کرتی ہے تو تخلیقی عمل اس کے لئے نئی صورت یا ہیئت مہیا کرتا ہے۔ اس طرح نظم کو ایک نئے وجود کی حیثیت مل جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ہر تخلیق دوسری تخلیق کی نسبت سے نئی ہوگی، یعنی اس سے الگ اپنے وجود کو تسلیم کرائے گی۔ ایک شاعر کی فنّی تخلیق دوسرے شاعر کی فنّی تخلیق سے اور خود ایک شاعر کی ایک نظم اسی شاعر کی دوسری نظم کے مقابلے میں اپنا الگ وجود رکھے گی تو نئی ہوگی، ورنہ نہیں۔''

(نئی نظم کا سفر، ص:۲۲)

خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس بحث سے ہم متفق ہوں یا نہیں، اس بات کے ماننے سے ہمیں انکار نہ ہونا چاہئے کہ ایک نیا ادبی فن پارہ وہی کہلائے گا جو اپنی تکنیک، موضوع اور مواد کے اعتبار سے الگ اور منفرد ہوگا۔ وہ نہ صرف کسی دوسرے ادیب و شاعر کی تخلیقات سے بلکہ خود شاعر یا ادیب کی اپنی اس تخلیق سے الگ اور منفرد ہوگا، جو وہ پہلے تخلیق کر چکا ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کے لئے خود کو دہرانا بھی ایک نامناسب بات ہے۔

اُردو نظم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایسے نظم گو شاعر ضرور مل جاتے ہیں، جنھوں نے تازہ مضامین اور منفرد لہجے کی بنیاد پر اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ انھوں نے خود کو دہرایا بھی کم ہے، لیکن شاعر کا ایک مخصوص مزاج طے ہو ہی جاتا ہے، جو نہ صرف اس کے خیالات کی تکرار بلکہ بندھے بندھائے علائم اور تراکیب کی بدولت خلق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کو ہی لیجیے۔ اپنے عہد میں ان کی باتیں بھی نئی اور انوکھی تھیں، لیکن اقبال بالآخر اپنے عہد کے ایسے شاعر کہلائے جس کا کام قوم کو پیام دینا تھا۔ یہی نہیں وہ 'شاعر مشرق' بھی کہلائے۔ گویا انھوں نے مشرقی قوموں کے مسائل اور مصائب کو جس انداز اور جس تواتر کے ساتھ پیش کیا، وہی ان کی شہرت کا باعث بنا۔ اعظمی اسے اقبال کا 'زیاں' مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> ''اقبال کی قومیت، ملّیت اور ان کے افکار پر اس قدر زور دیا گیا کہ جدید اردو نظم کے مزاج کی تشکیل میں ان کا جو کارنامہ ہے، اس کی طرف ہماری نظر عام طور پر نہیں جاتی۔''

(نئی نظم کا سفر، ص:۱۱)

اعظمی نے نئی نظم کی تعریف کرتے ہوئے اسے کسی زمانی حصار میں قید نہیں کیا تھا۔ نئی نظم کی تعریف کرتے ہوئے ہمارا مقصد بھی اسے کسی زمانی حصار میں باندھنا نہیں ہے، تاہم ہمیں اس بات کی جستجو ضرور ہے کہ کوئی ادب نیا کب تک رہتا ہے اور پُرانا ہو جاتا ہے تو کب؟ خلیل الرحمٰن اعظمی کی مانیں تو ادیب و شاعر خود کو دہرانے میں پُرانے اور فرسودہ ہو جاتے ہیں، تو کیا ہم یہ مان لیں کہ ہمیں ہر نظم کے لئے ہیئت کا کوئی الگ پیمانہ اور مواد کا کوئی منفرد پہلو ڈھونڈنا ہوگا۔ اگر اعظمی کی بات سے ہم سراسر اتفاق نہ بھی کریں تو یہ مان ہی سکتے ہیں کہ ادب میں ہر لمحہ ایک تازہ کاری کی ضرورت ہے۔ تحریکات، رجحانات، نظریات وغیرہ پر ہم لاکھ ناک بھوں چڑھائیں لیکن دیکھئے تو دنیا کی ہر زبان کی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کبھی نظریات کی بنیاد پر تو کبھی تحریکات کی بنیاد پر۔ شاعر و ادیب کے اسلوب کو اہمیت دی گئی ہے، لیکن اگر ایک ہی اسلوب اس کی فکر پہ غالب رہے اور اس کے فن کی قدریں استوار کرے تو پھر اس پر بھی

اسلوبیاتی اعتبار سے خود کو دہرانے کا الزام لگ سکتا ہے۔

ادب کے ترقی پسند، جدید، مابعد جدید میں بٹ جانے کے بعد ہم نے سوچا کہ اب آگے کیا؟ پچھلے ۳۰ رسال سے شاعر و ادیب کیا لکھ رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد یہ جاننا ہے کہ نظم میں پچھلے تیس برسوں میں کیا لکھا جا رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مابعد جدید کے بعد کچھ اور نیا ہے بھی یا نہیں۔ کیا جدید اور مابعد جدید کے درمیان جو نظمیں لکھی گئیں، ان سبھوں پر بات ہو چکی ہے، تمام شعرا کے اسلوب کو پرکھ لیا گیا یا پھر کچھ ایسے بھی ہیں، جن پر کم توجہ دی گئی اور وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ وہ طرزِ اظہار کی وجہ سے الگ اور منفرد تھے یا موضوعات کی بنیاد پر کھاپ نہیں کھاتے تھے۔ اگر منفرد اور الگ ہونا نئے پن کی دلیل ہے، اگر وہی عصبیت سے باہر نکل کر بات کرنا تازہ کاری ہے تو کیا پچھلے ۲۵-۳۰ رسوں میں ایسی کوئی نظم نہیں لکھی گئی جس پر گفتگو ہو سکے۔

پچھلے چند برسوں میں مسلسل لکھنے والے جو نظم گو شاعر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، ان میں ایک اہم نام جینت پرمار کا ہے۔ پرمار کا لہجہ نیا اور منفرد تو ہے ہی، ان کے موضوعات بھی الگ اور انوکھے ہیں۔ مثلاً جینت پرمار کی نظم 'منو' اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں ایک الگ اور اچھوتی نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے منوسمرتی کے خالق منو سے مخاطب ہو کر تیکھے اور طنزیہ لہجے میں اس طبقاتی فرق پر سوالیہ نشان لگایا ہے جس کی بنیاد پر انسان محض اس لئے حقیر اور کمتر مانا جاتا ہے کہ وہ پسماندگی کا شکار ہے۔ جینت پرمار کہتے ہیں:

''ایک نہ ایک دن/ گھر کے آگے/ نیم کی شاخ پر/ ننگا کر کے/ لٹکا دوں گا تجھ کو منو!/ تیری رگوں کو چیر پھاڑ کر دیکھوں گا/ تو نے پیا ہے کتنا لہو/ میرے بزرگوں کا!/ ایک نہ اک دن/ تیری کھال ادھیڑ دوں گا/ ہمیں تو صرف/ براہمن، کھشتریہ اور ویشیہ کی/ سیوا کرنا تو نے لکھا تھا/ چمار، بھنگی اور چانڈال کی تو نے لکھی تقدیر/ گانو کے باہر رہنا اور/ ٹوٹے ہوئے برتن میں کھانا/ یہاں کا بھینسہ بھی پنڈت!/ گدھا بھی گنگا جل پیتا ہے!!/ لیکن تجھ کو ہے معلوم/ اب میں نے چیل کی مانند اُڑنا سیکھ لیا ہے/ شیر کی مانند جست لگانا سیکھ لیا ہے/ لفظوں کو ہتھیار بنانا سیکھ لیا ہے/ ایک نہ اک دن/ تیری کھال ادھیڑ کے تیرے ہاتھ میں رکھ دوں گا/ تو نے میرے باپ کو ننگا کر کے مارا تھا ایسے.....!!

(مجموعہ: اور، ص: ۸)

اس نظم کو آپ نہ تو اقبال اور فیض کی روایت سے باندھ سکتے ہیں، نہ ہی اس پر ان کے اسلوب کی چھاپ دیکھ سکتے ہیں۔ جینت کی ایک اور نظم ہے 'نظم نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا' اس نظم میں شاعر نظم سے اپنا رشتہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

''جنون میں ہم رات رات بھر جاگے تھے/ کاغذ اور قلم کے بیچ/ قلم کا اندھیارا پلکوں پر لیپ دیا تھا/ پکنے دیا تھا بالوں کو/ سفید چاندی کی مانند دل کو زخمی ہونے دیا تھا/ ایک ایک مصرعے کی چاہت میں/ اوروں کا دکھ اُٹھا لیا تھا/ اپنے کاندھوں پر ہم نے/ اک اک لفظ بانٹ دیا تھا/ آج میں نظم کے بھیتر ہوں/ اور نظم ہے میرے بھیتر!''

(مجموعہ: اور، ص: ۲۹)

شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

''نظم یعنی تخلیقی قوت اور کائنات میں فن کے وجود کا احساس، شاعر کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اسے غلط لوگوں، غلط جذبات، غلط صورتِ حالات سے مفاہمت کرنے یا ان کے سامنے جھکنے سے باز رکھتا ہے۔''

فاروقی صاحب، جینت پرمار کو 'جدید' شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''ادب کے وہ متجسس اور انتھک طالب علم ہیں اور بہت عمدہ جدید شاعر ہیں۔ 'جدید' میں نے جان بوجھ کر کہا کیونکہ آج جو اچھی شاعر ہو رہی ہے، وہ جدید ہی کہلانے کی مستحق ہے۔''

۱۹۹۹ء میں لکھے گئے اس تبصرے سے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ فاروقی کی فرہنگ میں مابعد جدید کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

مصحف اقبال توصیفی کا پہلا مجموعہ 'فائزا' ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ روزگار کے سلسلے میں جیالوجیکل سروے آف انڈیا کے محکمے سے تاعمر وابستہ رہے۔ ان کی شاعری کے متعلق آل احمد سرور کا کہنا ہے:

''آپ نے نئے شعرا کی صف میں اپنے لئے اک ممتاز جگہ بنالی ہے۔ آپ کی شاعری نئی حسیت کی آئینہ دار ہے اور اس دور کا سوز و ساز اور درد و داغ آپ کے یہاں ساری رعنائی کے ساتھ ملتا ہے۔''

مصحف اقبال توصیفی اپنے مجموعے 'دور کنارا' (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''خارجی عوامل ہماری زندگی پر اس طرح حاوی ہو گئے ہیں کہ انھوں نے ہمارے معمولات زندگی کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔

عام آدمی معمولاتِ زندگی کو ہی زندگی سمجھتا ہے۔ اس کی مثال ایک عادی مجرم کی سی ہے جو اس طرح جرم کرتا ہے، جیسے ہم بیڈ ٹی پیتے ہیں یا شیو کرتے ہیں۔ شاعر بھی ایک عام آدمی، ایک عادی مجرم کی طرح ہے، لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ اور وہ یہ ہے کہ اسے اپنے جرائم کا احساس ہے۔ وہ جرم تو کرتا ہے، لیکن پھر اُچک کر جج کی کرسی پر بھی جا بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو مسلسل سزائیں سناتا رہتا ہے۔ جب وہ انسانی قدروں، اپنے آدرشوں، اپنے خوابوں کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھتا ہے تو اعلانِ جنگ کر دیتا ہے۔ خود اپنے خلاف بلکہ اس معاشرے کے خلاف جس کا وہ حصہ ہے۔''

توصیفی کے ان خیالات کی روشنی میں ان کا کلام دیکھیں تو وہ سماج کو ایسی جگہ کے طور پر دیکھتے ہیں، جہاں انسان وقت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ یہ بہت حد تک درست بھی ہے، لیکن اسی دنیا میں انسان مجبورِ محض ہوتے ہوئے بھی زندگی کو اپنے حوصلے کی بنیادوں پر اپنی طرح استوار کر لیتا ہے۔ جہاں تک شاعر کا تعلق ہے، ہر شاعر میں نہ تو احساسِ جرم ہوتا ہے نہ منصفانہ سوچ۔ ہر شاعر کے اندر احتجاج اور بغاوت کا جذبہ بھی نہیں ہوتا۔ تاہم توصیفی کے یہاں جس شاعر کا کردار ہے وہ ایک لاتعلق سا شاعر ہے جس کے اندر بے نیازی ہے۔ کہتے ہیں:

''وہ چلتا رہا/ اس کرۂ ارض کی گیند پر ایک پاؤں رکھے/ دوسرا پاؤں اس کا خلا میں/ گیند آگے بڑھاتے ہوئے (توازن بھی قائم رہے) (قیامت کو ٹالے ہوئے) وہ چلتا رہا (زیست اور موت کے دائرے کھینچتا) ایک ہی سمت میں/ ایک رفتار سے کسی بازی گر/ ایک سرکس کے نٹ کی طرح/ چاند، سورج، ستاروں کے گولے/ کبھی دونوں ہاتھوں سے اس کو اُچھالے/ کبھی اپنے شانوں پہ..... سر پر سنبھالے ہوئے کبھی گونج میں تالیوں کی.... بے نیازانہ چلتا ہوا/ ہاتھ پتلون کی دونوں جیبوں میں ڈالے ہوئے!''

(نظم: وقت)

ہیئت کے اعتبار سے دیکھئے تو شاعر نے جگہ بہ جگہ قوسین کا استعمال کیا ہے۔ گویا اسے طریقۂ اظہار پر بھروسہ نہیں ہے اور وہ بہت ساری باتیں قوسین کے درمیان کہہ کر گویا اپنی باتوں کی وضاحت کر دینا چاہتا ہے یا اس بات کا اطمینان کر لینا چاہتا ہے کہ اس کی باتیں لوگوں تک پہنچ رہی ہیں اور وہ ان سے اپنی کیفیت بتانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

شین۔ کاف نظام، عبدالاحد ساز، خلیل مامون جیسے شعرا نے بھی اردو نظم کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ خلیل مامون کے بارے میں محمود ہاشمی کا کہنا تھا:

''خلیل مامون نے اپنے عہد میں ظلمت کی جس رات کو Witness کیا ہے، اس میں شاعر کے پاس صرف ایک زرہ بکتر ہے اور وہ ہے ذات کی تابانی، روح کے احساس کی بیداری، جو تمام بھیانک قوتوں کے خلاف انسان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ تاریکی سے روشنی کی طرف لے جانے کی جستجو۔ کرشن نے بھی اور قرآن کریم نے بھی روشنی کی جستجو کو زندگی کا مقصد قرار دیا۔ زندگی کے اسی بنیادی مقصد اور اپنے عہد کی اندوہناک تاریکیوں میں ذات کی جستجو، یہی ہمارے شاعر مامون کا استعارہ ہے۔''

خلیل مامون کی شاعری ہمت اور حوصلے کی شاعری ہے۔ وہ زندگی سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کے یہاں نامساعد حالات کی کوری شکایت یا اپنے دکھوں کا مسلسل رونا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'خواب باقی ہیں'۔ اس عنوان کی پوری نظم ملاحظہ ہو:

''نیلے نیلے آسمان، ہرے بھرے پیڑوں/ سرخ سرمئی مٹی کو تاکتے جی نہیں بھرتا/ آنکھیں نہیں تھکتیں/ خالی منظر کی لازوال خاموشی میں سو بول چھپے ہیں/ سبز سبز پتوں پر/ شبنم کے آئینے سجے ہیں/ ڈال ڈال پر خوابوں کے سو پھول کھلے ہیں/ تاریخ کا نیزہ ابھی میری چھاتی کے پار نہیں ہوا/ کال چکر کا شور ابھی یہاں نہیں آیا/ ابھی آواز کی جلتی دھوپ کا جلتا سایہ یہاں نہیں چھایا/ سانسیں ابھی بیکار نہیں ہوئیں/ جیون ابھی بیگار نہیں ہوا/ جاگتی آنکھوں کے سونے آنگن میں/ ابھی بہت سے خوابوں کی/ سنہری کرنیں پھوٹ رہی ہیں!''

اردو میں نظم کہنے والی خواتین نے بھی موضوعات کا تنوع پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اسلوب کی تازگی کے نمونے پیش کئے۔ انھوں نے مرد اساس معاشرے کی پول کھول کر دی۔ بہت بے باکی کے ساتھ انھوں نے عورتوں کے ساتھ روا رکھے گئے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی اور نظم کو اپنا ہتھیار بنایا۔ مرد کی جھوٹی محبت اور دکھاوے کو بھی انھوں نے محسوس کیا۔ شخصی آزادی کا تصور اس سے پہلے عورتوں کی شاعری میں اس طرح پیش نہیں ہوا تھا، نہ ہی انھوں نے جنسی موضوعات پر اتنا کھل کر لکھا تھا، جتنا بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں لکھا۔ اسے

انگریزی زبان کے بڑھتے ہوئے اثرات سمجھئے یا تعلیم سے عورتوں کا شغف کہ انھوں نے شخصی آزادی کے معنی سمجھ لئے اور اسے حاصل کرنے کے لئے کمر بستہ ہوگئیں۔ انھوں نے مذہب کو بھی نہیں بخشا اور مذہب کے نام پر ہونے والے استحصال کو خوب نشانہ بنایا۔ کشور ناہید کہتی ہیں:

''میری بنو/ سورج مکھی کی طرح/ گھر کے حاکم کی رضا پر/ گردن گھماتے گھماتے میری ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی ہے!''

ایک دوسری نظم میں فرماتی ہیں:

''مگر مجھے مکھی جتنی آزادی بھی تم کب دے سکو گے/ تم نے عورت کو مکھی بنا کر بوتل میں بند کرنا سیکھا ہے!''

کشور ناہید عورت کی اس بدتر حالت کے لئے اس پورے سماجی نظام کو ذمہ دار مانتی ہیں جس نے عورت کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر رکھا ہے۔ کہتی ہیں:

''گھاس بھی مجھ جیسی ہے/ ذرا سر اُٹھانے کے قابل ہو/ تو کاٹنے والی مشین اسے مخمل بنانے کا سودا لئے ہموار کرتی رہتی ہے!''

فہمیدہ ریاض کہتی ہیں:

''میں تو مٹی کی مورت ہوں/ کیا ہوا اگر اس مورت میں/ بہتا ہے لہو کا اک دریا—!''

عورتوں کو صرف ایک جسم سمجھنے کی عادت کے خلاف فہمیدہ احتجاج کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''لمبی رانوں سے اوپر/ اُبھرے پستانوں سے اوپر/ پیچیدہ سی کوکھ کے اوپر/ اقلیما کا سر بھی ہے!''

پروین شاکر کی ابتدائی شاعری میں ایک طویل عرصے تک نوعمر لڑکی کے جذبات کی عکاسی ہوتی رہی، لیکن دھیرے دھیرے ان کی شاعری میں بھی گھر کے اندر اور باہر مرد اساس معاشرے میں عورتوں کے استحصال کی شکایت ملنے لگی۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ شاعرہ جنسی بنیادوں پہ روا رکھی گئی تفریق کو محسوس کرنے لگی ہے اور اس کا اظہار اسے ضروری معلوم ہونے لگا ہے۔ 'خوشبو' میں نظر آنے والی ایک الھڑ دوشیزہ 'انکار' تک بالغ ہو جاتی ہے اور وہ عشق و عاشقی کی فضا سے نکل کر احتجاج کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان تین شاعرات پہ اردو شاعری کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ان کے بعد بھی اردو شاعرات کی ایک بڑی کھیپ نظر آتی ہے جو نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان سے ہجرت کر کے امریکہ، جرمنی، کینیڈا وغیرہ میں اردو شاعری کی آبیاری میں مسلسل مصروف ہیں۔

سرحد کے اِس پار یعنی ہندوستان میں آزادی سے قبل ہی شاعرات نے ادب کی تخلیق میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور شاعری میں کچھ نئے نام نظر آنے لگے تھے۔ نظم کہنے والی شاعرات میں نمایاں نام ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور شفیق فاطمہ شعریٰ کے رہے۔ ان شاعرات کے یہاں تانیثیت سے زیادہ وجودیت کے حوالے ملتے ہیں۔ ساجدہ زیدی کی شاعری میں موضوعات کا بے پناہ تنوع ہے۔ انھوں نے اپنے اطراف میں پھیلی دنیا کو جی بھر کر دیکھا اور تقریباً سارے اہم موضوعات پہ خامہ فرسائی کی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے اپنی شاعری سے متعلق جو کہا ہے اسے من وعن مان لینا ضروری نہیں، لیکن اپنی شاعری کے متعلق شاعر کے دعوے کو یکسر خارج کر دینا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اپنی شاعری کے سروکار پہ بحث کرتے ہوئے ساجدہ کا کہنا ہے کہ ''میری شاعری کے سروکار (میرے فطری رجحان کی طرح) انسانی تقدیر کے بنیادی پہلوؤں سے اور حیات و کائنات کے بنیادی مسائل سے زیادہ رہا ہے''۔ انھوں نے علامات و استعارات بھی نئے نئے اختراع کئے۔ انہیں اس کا احساس بھی تھا۔ اپنے مجموعہ 'پردہ ہے ساز کا' کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

''میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ نظم یا شعر کو عریانی سے بچاؤں اور علامت و استعارہ کی تخلیق سے زبان کے معنوی امکانات اور ہر لفظ کی رسائی کی حدود دریافت کروں۔''

ساجدہ کی ایک نظم 'ہماری روح کا نغمہ کہاں ہے' سے مثال کے طور پر ایک ٹکڑا پیش کیا جا سکتا ہے۔

''بڑے گہرے سمندر موجزن تھے کرۂ دل میں/ جنہیں اک جستجوئے خام نے خاموش کر ڈالا/ بہت منہ زور موجیں تھیں/ جنہیں خود ہم نے پابندِ سلاسل کر دیا اک دن/ فرازِ کوہ سے آتے ہوئے بے تاب دریا تھے/ جنہیں اک دائرے میں رقص کرنا ہم نے سکھلایا/ تقاضے ہوش مندی کے ہمارے راہبر نکلے/ فرازِ آرزو سے ہم/ نشیبِ عافیت میں آن نکلے/ اور۔۔۔/ مآلِ روز و شب کے بیش و کم میں گم ہوئے/ اپنی متاعِ خود نگاہی چھوڑ آئے/ اک سکوتِ آہنی ہمراہ لے آئے

شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظموں میں بھی حیات و کائنات، فنا و بقا کے مسائل خوب بیان ہوئے ہیں۔ شعریٰ نے اپنی طرح کی تراکیب وضع کی ہیں۔ ان میں کسی کی نقالی یا پیروی نہیں کی گئی ہے۔ ایک طرف فارسی الفاظ کا بے تحاشا استعمال ہوا ہے تو دوسری طرف ہندی کے سبک اور سجل الفاظ بھی کام میں لائے گئے ہیں۔ نغمہ زارِ درد، سکوتِ فاصلۂ بے کنار، جگر سوختگانِ دو جہاں کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں سمئے کی آندھی اور گھاس

بن جیسی تراکیب اور امیجری بھی ملتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں۔ اردو میں ابتدا سے ہی اس طرح کی تراکیب کا استعمال عام رہا ہے۔ قلی قطب شاہ، ولی اور سراج ہوں یا فائز اور آبرو۔ اردو کی گنگا جمنی تہذیب ہمارے اردو شاعروں کے یہاں ہر دور میں پوری طرح نمایاں رہی ہے۔ شعریٰ کی چند نظمیں ایسی ہیں جو مذہبیت کی طرف ان کے جھکاؤ کو نمایاں کرتی ہیں۔ غور کریں تو شعریٰ کی شاعری میں دماغ کا زیادہ استعمال ہوا ہے اور دل کا کم۔ انوکھی تراکیب اختراع کرنے کی کوشش میں اکثر ان کے یہاں نامانوسیت راہ پا گئی ہے جس سے نظم کی روانی متاثر ہوتی ہے۔ اردو شاعرات میں رفیعہ شبنم عابدی بھی ایک نمایاں نام ہے۔ رفیعہ کی نظمیں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں آپ کی شاعری میں انسانی جذبات کی پاسداری ملتی ہے۔ آپ نے نسائیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے بلکہ ایک عورت کے نرم و نازک احساسات کو بڑی خوبی سے اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد نظم گو شاعرات میں شہناز نبی، شائستہ یوسف، ملکہ نسیم، عذرا پروین، ترنم ریاض، شبنم عشائی، کہکشاں تبسم وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان شاعرات کے یہاں اگر ایک طرف مرد اساس معاشرے سے تنفر کا احساس گہرا ہے تو دوسری طرف نا مناسب حالات و واقعات سے متصادم ہونے کا حوصلہ اور ان سے لڑنے کی بے پناہ طاقت بھی۔ رشتوں کی پامالی، اقدار کی شکست و ریخت، صارفیت کا بے جا دباؤ، مذہبی تفرقے، سماجی و سیاسی ریشہ دوانیاں، طبقاتی کشمکش، سرحد کے تنازعات، ہجرت کے مسائل، دہشت گردی کے نتیجے میں پیش آنے والے مصائب، نسائی جذبات، فلسفیانہ تفکر، غرض کیا ہے جو اِن شاعرات کی نظموں میں نہیں ملتا۔ چند چھوٹی چھوٹی مثالیں شاید میری بات کی وضاحت کو کافی ہوں۔

ان جانے ہی رتھوڑا تھوڑا سفر بہت سارے رستوں کی/ان بوجھے ہی/ٹکڑا ٹکڑا چھاؤں بہت سارے پیڑوں کی/اپنا تو کچھ اور ہی من تھا/اک مٹھی بھر چھت کی ٹھنڈک/اک چٹکی بھر دھوپ کی راحت/ایک کنوئیں کا نرمل پانی/لیکن جانے کیوں قدموں کو/چھونے سے پہلے زنجیریں/موئے آتش دیدہ ہوئی ہیں/گھاٹ گھاٹ رمتی ہے جوگن/اپنے اندر کا برندا بن/باہر کتنا پھیل گیا ہے۔ (شہناز نبی)

شہناز نبی کے یہاں حقیقت کو داستانوی فضا میں بیان کرنے کا خوبصورت انداز ملتا ہے۔ حقیقت کو علامات کے سہارے بیان کرنے کا یہ فن ان کی شاعری کو ایک طرح کی ایمائیت سے ہم کنار کرتا ہے۔

سنو شاہزادے/کھلی چھت پہ سونا منع ہے/یہ مانا پرستان پریوں سے خالی ہے/لیکن ابھی تک یہاں/کالے دیووں کی سازش کا خدشہ لگا ہے/کسے کب اٹھا کر کہاں لے کے جائیں/جکڑ کر رکھیں کرسیوں سے/کہ اندھے کنوئیں میں چھپا دیں/کہ فرضی تصادم میں کر دیں کہیں ڈھیر/برسوں کا کینہ نکالیں/کھلی چھت پہ سونا منع ہے/کہ سایہ پری، جن یا دیووں کا ہرگز نہ تم پر پڑے/تمہیں کوئی آفت نہ چھوئے/یہ مانا کہ موسم سہانا ہے/ٹھنڈی ہوا/چندرما بھی ہے پورا/مگر آندھیوں کا بھروسہ نہیں ہے/نہ جانیں اٹھیں کب/فلک سے ستاروں کو نوچیں/کریں چاند کے ٹکڑے ٹکڑے/ہواؤں میں بارود کی بو بکھیریں/تمہارے گلے میں کوئی تختی ڈالیں/لکھیں کوئی نمبر/جسے یاد رکھنے کی موہوم کوشش میں تم/بھول جاؤ گے پیارا سا اک نام اپنا/جنم کنڈلی میں جسے/ماں نے لکھوایا تھا/بڑے چاؤ سے

(شہناز نبی)

شبنم عشائی کی نظموں میں انسان کے درد و کرب کا بہترین اظہار ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں نسائی معاملات تو ملتے ہی ہیں تاہم ایک عورت جب دنیا کو ایک انسان کی نظر سے دیکھتی ہے تو اس کا لہجہ مختلف ہو جاتا ہے۔

چالیسواں دن ہے کرفیو کا/اب وادی ہی میں نافذ نہیں/کرفیو تیرتا ہے/لہو میں میرے خامشی سے/چاند کے ساتھ ساتھ/بن جاتا ہے باطن کی آنکھ/لے لیتا ہے اپنے دسترس میں میرے دن رات/ جاگتے خیال اور سارے ثواب/بے چینی کے تلاطم میں/بے بسی کے تصادم میں/جسم چھوڑ دیتا ہے چاند کا ہاتھ/کرفیو کی کائنات میں/خاموشی کا سناٹا/آنسو بن کے ٹپکتا ہے/من کے دائرے بھگوتا ہے/پل پل/رات رات

(شبنم عشائی)

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہی سرحد کے اس پار اور اس پار نوجوان شعرا نے بہترین نظمیں پیش کی ہیں۔ ہندوستان میں خالد کرّار نیز پاکستان میں الیاس بابر اعوان، اختر عثمان اور علی اکبر ناطق بہترین شاعری پیش کر رہے ہیں۔ خالد کرّار کا شعری مجموعہ 'ورود' (۲۰۱۰ء) جدید اردو شاعری میں ان کی پہچان بنانے کے لئے کافی ہے۔ اس مجموعے میں ۴۶ غزلیں، ۹ آزاد غزلیں، اور ۴۵ نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کی خاص بات شاعر کے لہجے کی ندرت اور اسلوب کی پختگی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی

نے خالد کرّار کی نظم اور غزل دونوں کی تعریف کی ہے۔ 'ورود' کے بیک کور پہ خالد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''نظم و غزل دونوں میں ان کے یہاں تازہ خیالی اور شگفتگی ہے۔ غزل میں ان کی لفظیات جگہ جگہ غیر رسمی جرأت مندانہ اور تخلیقی چمک دمک کا پتہ دیتی ہے۔ نظم میں شیخ خالد کرّار کے موضوعات جدید موضوعات ہیں جن میں معاصر دنیا کی بھی جھلک بڑے حسن وخوبی سے آ گئی ہے۔''

خالد کی کئی نظموں میں انسان کے ہونے نہ ہونے پر تذبذب کا اظہار ملتا ہے۔ مثال کے طور پر نظم 'بلاعنوان' دیکھئے:

آنکھ واتھی/ ہونٹ چپ تھے/ اک ردائے یخ ہوا نے اوڑھ لی
تھی/ جبیں خاموش/ سجدے بے زباں تھے/ آگے اک کالا سمندر/
پیچھے صبحِ آتشیں تھی/ اور جب لمحے رواں تھے/ ہم کہاں تھے۔

'ورود' کا شاعر زندگی کی بے ثباتی اور وقت کی بے یقینی کا شکار ہے۔ وہ جس ماحول میں جی رہا ہے اس سے مطابقت استوار کرنے میں اس کی سانس اکھڑ رہی ہے۔ خالد کی جان کنی موجودہ دور کے ہر انسان کی جان کنی ہے۔ اس لئے اس کی شاعری دل کے قریب معلوم ہوتی ہے۔

نوجوان شاعروں میں عادل رضا منصوری کی شاعری بھی لائقِ توجہ ہے۔ عادل کی شاعری میں دورِ حاضر کی کشمکش کا بخوبی پتہ لگتا ہے۔ عادل نظم و غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حزن و ملال کی عجیب کیفیت ہے۔ عادل کے یہاں انسانی رشتوں کی پامالی کا گہرا احساس ہے۔ ان کی نظمیں مختصر، لیکن پر اثر ہوتی ہیں۔ نظم 'دو اجنبی' میں وہ کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

اک پتّی کے ٹوٹنے۔ گرنے کی آواز سے/ سہم اٹھا ہے/ سہتا
پیڑ/ بے تعلق شاخ پر بیٹھی ہے چڑیا/ ناک کے نیچے پڑا ہے
گھونسلہ .....بکھرا ہوا/ جس کے گرنے اور بکھرنے کی/ صدا
سے بے خبر ہے پیڑ/ مدّتوں سے/ وہ ہماری ہی طرح ہیں/
ساتھ ساتھ!!

پاکستان کے نوجوان شعرا میں اختر عثمان، علی اکبر ناطق اور الیاس بابر اعوان کی شاعری توجہ کی مستحق ہے۔ ان شعرا نے غزلوں اور نظموں کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ اختر عثمان کی نظموں میں موجودہ دور کے مسائل اور ان سے پیدا ہونے والی ناجی کیفیت کا اظہار بڑی خوش اسلوبی سے ہوتا ہے۔ انہیں رائیگانی کا احساس ستاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شاعری کے میلے میں خود کو گنوا کر انہیں تاسف ہوتا ہے گرچہ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ خود کو گنوا کر انھوں نے شعر کی آرائش کی ہے۔ ان کی ایک نظم 'میں عجب آدمی ہوں' ملاحظہ فرمائیے:

''میں عجب آدمی ہوں/ رائیگانی کے تسلسل نے مجھے توڑ دیا/
میری پونجی مرے قرطاس و قلم/ کچھ کتابیں پئے تسکینِ جنوں/
کون طالب ہے بھلا مایۂ بے مایہ کا/ کوئی جا گیر نہیں/ زندگی شعر
کے میلے میں گنوادی میں نے/ اس پہ نازاں تھا کہ ہر لفظ مرے/
حلقۂ احساس میں ہے/ اس پہ فاخر تھا کہ ہر خواب مرے کیسے
میں/ میں نے کیا کیا نہ فنِ شعر کی آرائش کی/ لفظ در لفظ محل/
حرف در حرف خیال/ سطر در سطر جنوں/ میں عجب آدمی ہوں/
زندگی شعر کے میلے میں گنوادی میں نے۔

علی اکبر ناطق پاکستان کے نوجوان شعرا میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا کلام سنجیدہ ناقدین نے بھی سنجیدگی سے پڑھا ہے اور ان کے کلام پر مدلل رائیں دی ہیں۔ اب تک ناطق کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ فاروقی صاحب نے ناطق کی پہلی کتاب 'بے یقین بستیوں میں' کے سلسلے میں کہا تھا:

''ناطق کی نظم کے مابعد الطبیعاتی سروکار میرا جی کی یاد دِلاتے
ہیں.....علی اکبر ناطق کو میرا جی کا مقلد نہیں کہہ سکتے، لیکن اِس
وقت اِن کے علاوہ کوئی شاعر ایسا بھی نہیں ہے جس کے شعر کی
گہرائیاں اور دُنیا کو دیکھنے اور برتنے کے طور اور اظہار کے
پیرائے ہمیں میرا جی کی یاد دلائیں۔''

ایسا نہیں ہے کہ کوئی ناقد کسی ادیب یا شاعر پر قلم نہ اٹھائے تو وہ ادیب یا شاعر بڑا ہونے سے رہ جاتا ہے تاہم یہ بھی سچ ہے کہ ناقدین کی بے توجہی کی وجہ سے اچھے فنکاروں کے مقبولِ عام ہونے میں تھوڑا وقت لگ جاتا ہے۔ ناطق کی شاعری ان کے ہم عصر شعرا سے قطعی مختلف اور ممتاز ہے۔ ان کا لہجہ نت نئی تراکیب سے مزین ہے۔ تشبیہات و استعارات میں ندرت ہے۔ ان کی شاعری میں اتنا دم ہے کہ وہ ناقدین کو اپنی طرف فوراً متوجہ کر لے۔ ان کے لسانی اور استعاراتی نظام پر بھی ناقدین نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کی شاعری میں عربی تہذیب و تاریخ کے عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے:

اُس کی نظمیں ساربانوں، خیموں، اونٹوں، سراب کی لہروں،
ریت کے ٹیلوں، صحرا کے زرد ماہتابوں، خشک ببولوں اور
کیکروں؛ اُن پر حلقہ ڈالے سانپوں، مشکیزوں، صحرائی
اژدہوں اور اِس نوع کے لاتعداد ذخیرۂ الفاظ کی زنبیل ہیں؛ یہ

سب الفاظ بے ترتیب نظام اور الل ٹپ صورتِ حال میں مجتمع نہیں کیے گئے، بلکہ نظموں کا Content اور اِن کی مجموعی فضا اِن کو مربوط کر کے ایک مکمل اور جامع نظامِ فکر و جمالیات کا حصہ بنا دیتی ہے؛ اِس صورتِ حال کو دِیکھتے ہوئے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرَب اور وسط ایشیا کے صحراؤں اور دیہاتی بدوی تہذیب کو جس طَور سے ناطق نے جزوِ نظم بنایا ہے؛ جدید اُردو نظم کا دامن اِس سے تہی ہے۔

(معاصر اردو نظم میں لسانیاتی اظہار کی وسعتیں۔ارسلان راٹھور)

ذیل میں ناطق کی ایک نظم 'ریت کے ٹیلے' نقل کی جا رہی ہے میں نے کہا تھا /آخر اک دن تھک جائیں گے /ریت کے ٹیلے کھودنے والے کب تک ٹیلے کھودیں گے/ ریت کے ٹیلے کھودنے والے تھک جائیں گے/میں نے کہا تھا دھرتی چھیدنے والے آخر رک جائیں گے/تیل کے چشمے ڈھونڈنے والے کب تک چشمے ڈھونڈیں گے/کتنک آگ کی مشکیں بھر کر گہرے کنوؤں سے کھینچیں گے/ چہروں پر چھڑکائیں گے/دھرتی کو دہکائیں گے/آخر اک دن تھک جائیں گے/میں نے کہا تھا بھاری ضربیں تھم جائیں گی کب تک تیشہ مارنے والے ہاتھ زمیں کو کوٹیں گے/نور کے ذرے توڑیں گے/شعلوں کو لہرائیں گے /کب تک راکھ اڑائیں گے ہانپ کے اک دن بیٹھ رہیں گے/میں نے کہا تھا دیکھنا آخر مینہ برسے گا /زرد ہوا کو مانجے گا/امبر کو چمکائے گا/سبز فضا لہرائے گی میں نے کہا تھا شور تھمے گا آنکھوں کے پھٹ جانے کا/زہر بجھے گا گندھک کا/لیکن میں نے جھوٹ کہا تھا/ریت کے ٹیلے کھودنے والے جنتے رہے ہیں ٹیلے کھودنے والوں کو/دیکھنا اک دن سارے ٹیلے بھڑک اٹھیں گے/گاڑھے دھویں کا ابر اٹھے گا/سانس گھٹے گی نورِ صبا کی /اور میں روتے روتے خود ہی تھک جاؤں گا۔

ناطق کی نظم قاری کو باندھے رکھتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ ان کی نظم درمیان میں چھوڑ دیں۔ان کی نظموں کی فضا مسحور کن ہے۔

الیاس بابر اعوان پاکستان کے جدید شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان کی نظمیں تازہ کاری کا احساس دلاتی ہیں۔ان کی تراکیب ان کی اپنی اختراع ہیں۔ لہجے میں حزن وملال نے ایک عجیب گہرائی پیدا کر دی ہے۔ دہشت گردی اب صرف ملکی مسئلہ نہیں بلکہ عالمی مسئلہ ہے۔ دنیا کے کس کونے میں دہشت گردی کا راج نہیں۔ بے قصوروں کا خون بہانے والے نہ مسجد دیکھتے ہیں، نہ مندر۔ایسے میں کوئی بھی حساس انسان آنکھوں میں خوف سمیٹے ہر لمحہ ایک دھماکے کا منتظر رہتا ہے۔ان کی ایک نظم 'مسجدِ احمریں' سے کچھ لائنیں دیکھیں:

عجب طلوعِ سحر ہوائی تھی/فلک کی سرخی اتر کے چشمِ تپاں میں آئی/ چہار سمتوں میں خندقیں تھیں/فضا میں رقصاں تھی بوئے وحشت/ درونِ مسجد بھی کلمہ گو تھے/وہ کلمہ گو تھے کہ جن کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا/ چہار جانب گھروں میں قیدی تھے/جن کے ہونٹوں سے بددعائیں پھسل رہی تھیں/میں قلبِ شہرِ سلام اندر/ نمِ تبسم سے آشنا تھا مگر یہ دن تھے/خجل فضاؤں کی بازیابی کی صورتوں کے/سفیر آتے سفیر جاتے بلکتے بچوں کی آہ وزاری/ نحیف لہجوں کی کپکپاہٹ سماعتوں سے الجھ رہی تھی/فضا میں خوف تھا دھند جیسے/ درونِ مسجد وہ اہلِ منبر وہ اہلِ جبہ/سفارتوں کی سبیلِ مخلوط میں الجھ کر/صراطِ ابیض سے ہٹ گئے تھے/میں ڈر گیا تھا میں مسجدِ احمریں کے دامن پہ ثبت پتھر/میں ایستادہ ہوں اب بھی، لیکن/ نہ مسجدِ احمریں ہے ویسی نہ مقتدی ہیں نہ طفل و مادر/نہ اہلِ منبر ہیں جن کی تقریر نے فضاؤں کا سانس کھینچا/نہ شورشیں شہرِ کلمہ گو میں/مگر حقیقت میں کیا ہوا تھا/لہو میں لتھڑی صفوں سے پوچھو/ چمن میں مردہ سفارتوں کی شبیہیں دیکھو/ میں مسجدِ احمریں کے دامن پہ ثبت پتھر/کئی زمانوں سے رو رہا ہوں/ مجھے بصارت نہیں بصیرت سے دیکھنے کا۔

غرض اردو نظم میں موضوعات کا تنوع بہت بڑھ چکا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے چاہے آزاد نظم اور نثری نظم کی ہیئت ہی مقبول ومحبوب نظر آ رہی ہو تاہم اس میں شک نہیں کہ لفظیات بدلے ہیں۔ نئی تشبیہات و استعارات کا اضافہ ہوا ہے۔ شاعرانہ حسیت نے بلندیوں کو چھو لیا ہے۔اردو میں نو آبادیاتی فکر، عورتوں کے مسائل، تانیثیت کا ظہور، آزادی کا نیا تصور، سائنس کی برکتیں اور تباہیاں، انسانی زندگی پر جدید ٹیکنالوجی کے اثرات غرض کیا نہیں ہے جو اب نظم کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔انسانی زندگی اگر اتنی متلون اور پہلو دار ہو تو اس کے تجربے بھی ضرور رنگا رنگ ہوں گے، جن کا اظہار وہ اپنے لہجے میں کرنے پر مجبور ہے اور یہی اس کے نئے پن اور انفرادیت کی پہچان ہے۔اس مضمون میں تمام شاعر و شاعرات کا ذکر ممکن نہ ہو سکا تاہم اگر اردو نظم کے موجودہ منظر نامے کی بات کریں تو درج بالا شعرا کا ذکر کیے بغیر نئی اردو نظم کی شناخت مقرر نہ ہو پائے گی۔

○○